

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ۱۳۰۰، جنوری۔ جون ۲۰۱۵ء

اداریہ

## اعتدال قرآن و سنت کی روشنی میں

ظفر الاسلام اصلاحی

سب سے پہلے یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ لفظ ”اعتدال“ کا ماخذ، جیسا کہ معروف ہے، عدل ہے یعنی شخص یا چیز کا جو حق ہے اس کا پورا خیال رکھا جائے یا اسے دیا جائے۔ کسی چیز کے ایک پہلو کو دوسرے پر بلاوجہ غالب نہ ہونے دیا جائے، ورنہ عدل و توازن کے منافی ہوگا۔ درحقیقت اعتدال ایک ایسی صفت ہے جو انسان کے بہت سے منفی جذبات کو قابو میں رکھتی ہے یا اسے ان کی شدت سے محفوظ رکھتی ہے جس کے اثر سے اس کے جذبات بر ایحجتہ نہیں ہوتے اور وہ ایسے کام سے بچ جاتا ہے جو بالآخر خود اس کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی نقصان اور تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ہو اس سے متعلق فکر و عمل میں اعتدال موجب خیر ہوتا ہے اور افراط و تفریط یا بے اعتدالی باعث وبال ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں امت مسلمہ کی امتیازی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ امت وسط ہے، یعنی اعتدال کا رویہ اپنانے والی یا میانہ روی اختیار کرنے والی۔ دوسرے لفظوں میں انتہا پسندی کی کیفیت یا حالت سے اپنے آپ کو بچانے والی۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا  
لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلٰی النَّاسِ  
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا

اور اس طرح ہم نے تم کو ایک ”امت

وسط“ بنایا ہے تاکہ تم سارے انسانوں

کے لیے دین حق کے گواہ بنو اور ہمارے

(البقرہ ۱۴۳/۲)

رسول تمہارے لیے گواہ ہوں

یہ بات بڑی اہم ہے کہ بعض مفسرین نے واضح طور پر ”لئے وسط“ کا مطلب معتدل امت بیان کیا ہے۔ بعض نے اسے ”خیر امت“ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ دونوں مفہوم کو جمع کر کے اس کی یہ ترجمانی بہت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جو امت معتدل یا اعتدال پسند ہوگی وہ خیر ہی خیر ہوگی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اسلام کی اس امتیازی خصوصیت کو مذکورہ بالا آیت کے حوالہ سے ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ”اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسکوں میں افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو ”لئے وسط“ (بقرہ: ۱۴۳/۲) [بیچ کی امت] کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے۔ اسی لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال و میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو نہیں بھولا ہے“ (سیرۃ النبی ﷺ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ۶/۳۳)۔ مزید برآں بعض ماہرین قرآنیات نے اس آیت (قل امر ربی بالقسط / الاعراف ۲۹/۷) کے حوالہ سے یہ واضح کیا ہے کہ اس میں راستی و انصاف کا جو حکم نبی کریم ﷺ کے توسط سے پوری امت کو دیا گیا ہے، اس میں راہ اعتدال اختیار کرنا بھی شامل ہے، اس لیے کہ اعتدال عدل کے لوازم میں سے ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے: ”تم کہو! میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ (ہر بات میں) اعتدال کی راہ اختیار کرو“۔ یعنی انھوں نے واضح طور پر ”قسط“ سے اعتدال ہی مراد لیا ہے۔ بلاشبہ اسلامی شریعت پوری کی پوری اعتدال میں رچی بسی ہے، اسی لیے اس شریعت کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ اسلام کی نظر میں اعتدال زندگی کے ہر شعبہ (عقائد، عبادات، اخلاقیات و معاملات) میں نہ صرف مطلوب ہے، بلکہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ یہ اسلام کی ایسی بنیادی خصوصیت ہے جو اس کے تمام احکام و تعلیمات میں نمایاں ہے اور اس کو حرز جاں بنانے میں سب کی بھلائی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: خیر الاموار اوسطھا [بہترین معاملات وہ ہیں جن میں میانہ روی اختیار کی جائے] (شاہ ولی اللہ دہلویؒ، جہل حدیث، اردو ترجمہ و تشریح: عبدالماجد دریابادی، حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت، بدون تاریخ، ص ۱۴)۔

نزول قرآن کے وقت عقاید کے باب میں ایک جانب یہ بے اعتدالی تھی کہ انسانوں کے ایک گروہ نے ان گنت معبود و مسجود بنا رکھے تھے، جن میں سورج، چاند، ستارے، پیڑ، پودے، پہاڑ، پتھر اور جانور سب کچھ شامل تھے۔ دوسری جانب یہ بھی انتہائی تھی کہ ایک جماعتِ انسانی نے سرے سے اللہ یا اس کائنات کے خالق و مالک کے وجود کا انکار کر دیا، جب کہ دوسری نے خدائی کا دعویٰ کر کے اپنے کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دیا اور لوگوں کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے کے لیے مجبور کر دیا۔ اسلام نے ان سب نقطہ ہائے نظر کو باطل ٹھہرا دیا، جیسا کہ قرآن کے اس برملا اعلان سے واضح ہوتا ہے:

إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ  
الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ (البقرہ ۱۶۳/۲)

تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے۔ اس  
رحمن و رحیم کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں  
اور پھر انسان کو صاف صاف لفظوں میں یہ حکم دیا گیا:

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ  
وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن  
كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (تُم السجدہ ۳۷/۳۱)

نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، بلکہ اللہ  
ہی کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا اگر  
تم واقعی اس کی عبادت کرنے والے ہو  
اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ کسی کی  
عبادت نہ کرو، صرف ایک اللہ کی عبادت کرو  
(بنی اسرائیل ۲۲/۱۷-۲۳)

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ دین اسلام کے مطالبات کا خلاصہ حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی ہے۔ قرآنی آیات میں غور و فکر سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ جگہ جگہ ان میں اعتدال و توازن قائم رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی ہدایت کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنے کی یاد دہانی کرائی گئی ہے (النساء ۲/۲، الانعام ۱۴۶/۶، الروم ۳۸/۳۰، الذاریات ۱۹/۵۱، المعارج ۲۵/۷۰) اور بعض مقام پر تو اللہ نے اپنی عبادت کے حکم کے فوراً بعد والدین، اقرباء، پڑوسی اور سماج کے کمزور طبقات (غرباء، مساکین، یتیم، مسافروں، غلاموں و خادموں) کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے یا نیک سلوک کی ہدایت دی ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ کسی کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کا لازمی تقاضا اس کے واجبی حقوق کی ادائیگی ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَأَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا  
وَيَسْأَلُ الَّذِينَ إِحْسَانًا وَّيَذِي الْقُرْبَىٰ  
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْعَجَارِ ذِي  
الْقُرْبَىٰ وَالْعَجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ  
بِالْحَنْبِ وَالْبَنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ  
أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ  
مُخْتَلًا لِّفُحُورًا (النساء، ۳۶)

اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی  
اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین،  
قربت مندوں، یتامی، مساکین،  
قربت دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی، مسافر  
اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک  
کرو۔ بے شک اللہ اترا نے والوں اور  
غور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

اسلام میں دونوں قسم کے حقوق میں توازن و اعتدال برتنے پر زور دینے کی وجہ  
صاف ظاہر ہے کہ اسلام رہبانیت (تمام خاندانی، سماجی، معاشی و سیاسی علاقہ و مطالبات  
سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لینا) کا سخت مخالف ہے (الحمدید: ۲۷/۵۷)۔ اسلام  
انسان کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے جس میں مذہبی و مادی تقاضوں میں  
توازن برقرار رہے اور دینی فریض کی تکمیل کے ساتھ دنیوی ضروریات پوری کرنے کی  
فکر و کوشش جاری رہے یا بالفاظ دیگر حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد کی پاسبانی  
ہوتی رہے۔ اسلام دنیوی مصروفیات (خواہ سماجی ہوں یا معاشی یا کوئی اور) سے منع نہیں  
کرتا، اور منع بھی نہیں کر سکتا، اس لیے اسلامی نقطہ نظر سے یہ دنیا آخرت کی تیاری کے  
لیے ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا فرمان بہت مشہور ہے: الدنیا مزرعة الآخرة (دنیا  
آخرت کی کھیتی ہے یعنی اس کی مصروفیات میں رہ کر) نہ کہ اس سے کنارہ کش ہو کر  
دوسری زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ درحقیقت اسی میں انسان کی اصل  
آزمائش ہے اور اسی مقصد سے اس دنیا میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ البتہ یہ اہتمام ضروری  
ہے کہ اس زندگی کی مصروفیات کو اس طور پر جاری رکھا جائے کہ اخروی زندگی کی تعمیر اور اس  
کی فلاح متاثر نہ ہو، بلکہ اس مقصد کا حصول مقدم رہے۔ قرآن کریم کی اس آیت سے یہی

نکتہ اخذ ہوتا ہے۔ ارشاد الہی ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ  
الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ  
الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ  
إِلَيْكَ (القصص: ۷۷/۲۸)

اور جو کچھ اللہ نے تجھے عطا کیا ہے، اس  
میں آخرت کا اگر طلب کر دو اور اپنے  
دنوی حصہ کو [لیتا] نہ بھولو۔ احسان  
کر دو [لوگوں کے ساتھ] جیسے اللہ نے

تمہارے ساتھ احسان کیا ہے

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں سعاد و معاش (یعنی معاد کی بہتری کی طلب اور معاش کے حصول) میں اعتدال و توازن قائم رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ اخروی زندگی کی بہتری کا مایابی بہر حال پیش نظر اور مقدم رہے۔ آیت کے آخری حصہ سے یہی پیغام ملتا۔ کہ دنیا کی جو چیز بھی حاصل ہو اسے اپنے فائدہ میں استعمال کرنے کے علاوہ دوسروں سے بھی اس سے نفع پہنچا کر اخروی زندگی کی تعمیر کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک دفعہ گجرات میں تاجر کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے اسی نکتہ کو بڑے موثر و بلیغ اسلوب میں ان الفاظ میں واضح کیا تھا: ”یہ دنیا اسی لیے دی گئی ہے کہ یہاں رہ کر اُس دنیا کا سودا کیجیے۔ آپ جس طرح افریقہ اور برما میں رہ کر رائڈر کو آباد کرتے ہیں، اسی طرح دنیا میں سودا کر کے آخرت کی آبادی کی فکر میں رہیں۔ اس دنیا میں رہ کر اور اس دنیا کے کاروبار کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق انجام دے کر اور خواہشات دنیا سے بچ کر اطاعتِ الہی کی تعمیل کر کے معرفتِ الہی اور رضائے الہی کی جو سرفرازی پائیں، تو یہی مجاہدہ ہے جو آدمؑ اور بنی آدم کے لیے مخصوص ہوا ہے اور جو فرشتوں کے حدود سے خارج ہے“ (علامہ سید سلیمان ندوی کے تفسیری نکات، مرتبہ محمد فرمان ندوی، مجلس تحقیقت و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۱۵ء، ۲۱۵/۱)۔

مومنین کس طور پر اس دونوں فکر کو اوڑھتے رکھتے ہیں اور ان کی تعمیر میں توازن برتتے ہیں، قرآن میں ان کی یہ کیفیت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:

رَجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ  
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ  
وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ (النور ۲۳/۳۷)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تجارت اور خرید و  
فروخت اللہ کی یاد، نماز کے اہتمام اور  
زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم ہمیں دنیا و آخرت  
دونوں جہاں کی بھلائی کی طلب کے لیے دعا (رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ  
حَسَنَةً وَفِنَا عَذَابَ النَّارِ البقرة ۲۰۱) کی ہدایت دی ہے، لیکن یہی کتاب ہدایت اس  
بات پر بھی زور دیتی ہے کہ پہلی موخر اور دوسری مقدم یا پہلی مرجوح اور دوسری راجح ہے۔  
کیوں؟ اس لیے کہ ارشاد خداوندی ہے:

بَلْ تُؤْتِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ  
خَيْرًا وَأَبْقَى (الاعلىٰ ۱۶/۸۷-۱۷)

لیکن تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے  
ہو اور [حقیقت یہ ہے کہ] آخرت  
[اس سے] بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے

والی ہے

واقعہ یہ کہ ایک مومن کے لیے دنیا کی بھلائی صحیح معنوں میں اسی وقت بھلائی  
کہلائے گی جب اس سے دوسری یا ابدی دنیا کی بھلائی کے لیے راہیں ہموار ہو جائیں۔  
اسلام کے معتدلانہ مزاج کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ خالصہ مذہبی  
معاملات یا عبادات میں بھی بے اعتدالی یا عدم توازن کو گوارا نہیں کرتا، خاص طور سے اس  
صورت میں جب کہ اس سے زندگی کے دوسرے تقاضوں کی تکمیل یا دوسروں کے حقوق کی  
ادائیگی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ سیرت نبوی ﷺ کے اس واقعہ سے اسی حقیقت کا انکشاف  
ہوتا ہے۔ حضرت انس ابن مالکؓ کی بیان کردہ یہ روایت بہت مشہور ہے کہ تین صحابیوں  
کے ازواج مطہرات سے نبی کریم ﷺ کی عبادات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے  
پر جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ یہ تو بہت کم ہے اور انھوں نے یہ سوچا کہ ان کا آپ ﷺ سے  
کیا موازنہ؟ آپ ﷺ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ پھر ان میں سے  
ایک نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ رات بھر نمازیں پڑھتے رہیں گے (اور سوئیں گے نہیں) اور

دوسرے نے یہ کہا کہ وہ ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھیں گے اور تیسرے نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا۔ جب نبی اکرم ﷺ کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو کہا خبردار! ہرگز ایسا نہ کرنا۔ میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سے زیادہ متقی ہوں۔ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی کبھی نہیں بھی رکھتا ہوں)، (رات میں) نمازیں پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے انحراف کرے گا وہ میری امت میں سے نہیں (صحیح بخاری، کتاب الرفاق، باب القصد و المداومة علی العمل)۔

اسی طرح کی ایک دوسری روایت زیر بحث معاملہ کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو بن عاصؓ زہدانہ و متقیانہ زندگی کے لیے معروف تھے۔ ایک بار انہوں نے یہ طے کر لیا کہ ہمیشہ دن میں روزہ رکھیں گے اور شب میں عبادت میں مصروف رہیں گے۔ حضور اقدس ﷺ کو خبر ہوئی تو انہیں بلا کر پوچھا: کیا یہ خبر صحیح ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، روزہ رکھو اور افطار بھی کرو، رات میں عبادت کرو اور سوؤ و بھی، اس لیے کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمانوں کا تم پر حق ہے اور (بعض روایت میں اضافہ کے مطابق تمہارے گھر والوں کا تم پر حق ہے)۔ تمہارے لیے مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا کافی ہے (صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم الدھر)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اعتدال کا تصور کتنا جامع و وسیع ہے کہ عبادت میں بھی اس کا پورا پورا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ عبادت میں مصروف رہنے کا مجوزہ طریقہ بے اعتدالی پر مبنی تھا۔ اس میں خود اپنے اعضاء جسم کی حق تلفی تھی اور دوسروں کے حقوق کی بھی عدم رعایت مضمّر تھی، اسی لیے آپ ﷺ نے انہیں اپنا ارادہ یا فیصلہ بدلنے کی ہدایت دی۔

عبادات میں نماز سے افضل کون سی عبادت ہو سکتی ہے۔ زیر بحث موضوع کے لحاظ سے یہ بات بھی کافی اہمیت رکھتی ہے کہ قرآن و حدیث میں نماز سے متعلق مختلف اعمال میں اعتدال برتنے کی واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ قراءت قرآن نماز کے فرائض میں سے ہے، اس

باب میں قرآن میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ نماز میں نہ تو بہت بلند آواز سے قراءت کی جائے اور نہ بالکل پست آواز میں، بلکہ بیچ کی صورت اختیار کی جائے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَلَا تَجْهَرُ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافُ  
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا  
اور اپنی نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھے  
اور نہ بالکل ہی دھیرے دھیرے۔ بلکہ  
(بنی اسرائیل ۱۷۱)

صاحب ”تذکر قرآن“ مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں: ”حکم ہوا کہ تمہاری نمازیں و دعائیں بہت زیادہ جبری نہ ہوں، نہ بالکل سرّی۔ تمہاری نمازوں و دعاؤں میں بھی امتِ وسط کی شان نمایاں ہونی چاہیے“ (قرآن کریم مع ترجمہ اور اخذ و تلخیص تفسیر تذکر قرآن، مرتبہ: خالد مسعود، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۳۶۰)۔ حضرت ابو بکر الصّدیقؓ اور حضرت عمر الفاروقؓ سے متعلق یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ اول الذکر تہجد کی نماز میں دھیمی آواز سے قرآن پڑھتے تھے اور ثانی الذکر کافی بلند آواز سے۔ آپ ﷺ نے اس کی وجہ دریافت کی تو دونوں حضرات نے اپنے اپنے طور پر اس کی وضاحت کی۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنی آواز کچھ بلند کرنے کی ہدایت دی اور حضرت عمرؓ سے اپنی آواز کچھ رست کرنے کے لیے فرمایا (حبیب اللہ ندوی، اسوۂ حسنہ، تاج کیمپی، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۲-۲۵۳)۔ یہاں یہ ذکر بر محل معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جب ایک صحابی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ نماز پڑھاتے ہیں تو بہت لمبی قراءت کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے اس پر ناگواری ظاہر کی اور مسجد نبوی ﷺ کے منبر سے علانیہ یہ ہدایت جاری کی کہ ”جو شخص امامت کرے، وہ ہلکی نماز پڑھائے، کیوں کہ نماز میں بوڑھے، مریض اور حاجت مند لوگ بھی ہوتے ہیں“ (صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب اذا تحول الامام و كان للرجل حاجة)۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ دعا کو مسخ العبادۃ (عبادت کا مغز) کہا گیا ہے اور نماز کے اندر اور باہر حال میں دعا ذکر الہی مطلوب ہے اور ہر مومن اس میں مصروف رہنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ دعا دل میں چپکے چپکے مانگی جاسکتی ہے اور آواز کے ساتھ بھی، لیکن دوسری صورت میں قرآن نے اعتدال برتنے کی تعلیم دی ہے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:



وَ اذْ كَسَرَ رَبِّكَ فِى نَفْسِكَ  
تَضَرَّعاً وَ خِيفَةً وَ ذُؤُونَ الْجَهْرِ مِنْ  
الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْآصَالِ

اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کیجیے دل ہی دل  
میں گڑ گڑاتے ہوئے اور اس سے خوف  
کھاتے ہوئے اور پست آواز سے بھی

(الاعراف ۲۰۵/۷)

صاحب ”معارف القرآن“ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ”دون الجھر“ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: ”یعنی زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔ یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے والے کو یہ بھی اختیار ہے کہ آواز سے ذکر کرے، مگر اس کا ادب یہ ہے کہ بہت زور سے چیخ کرنے کرے، متوسط آواز کے ساتھ کرے جس میں ادب و احترام ملحوظ رہے“ (معارف القرآن، مکتبہ مصطفائیہ دیوبند، بدون تاریخ، ۱۶۶/۴)۔

”انفاق“ قرآن کریم کی ایک معروف اصطلاح ہے جس سے مراد اپنے مال و اسباب سے کسی ضرورت مند کی مدد کرنا یا کسی کار خیر میں مال کو خرچ کرنا ہے۔ صدقہ و خیرات کرنا بھی اس میں شامل ہے جسے بجا طور پر نقلی عبادت کہا جاتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں اس کی فضیلت بیان کی گئی اور اس پر اجر کثیر کا وعدہ الہی مذکور ہے، لیکن اس باب میں بھی قرآن و حدیث میں اعتدال و میانہ روی کی تاکید ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انفاق میں بھی اعتدال کی راہ پسند کرتا ہے۔ نہ تو صاحب مال سے یہ چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ لٹا دے اور خود آخر میں محتاج و در ماندہ بن کر رہ جائے اور نہ اس کی نظر میں یہ مطلوب ہے کہ وہ مال خرچ کرنے سے ہاتھ کو اس طرح روکے رکھے کہ اپنی ضروریات واجبہ بھی نہ پوری کر سکے۔ ارشادِ باری ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ  
عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ  
الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا  
(بنی اسرائیل ۲۹/۱۷)

اور نہ اپنے ہاتھ کو گردن میں باندھے  
رکھو [کہ کسی کو کچھ دہ ہی نہ] اور نہ  
اپنے ہاتھ کو بالکل کھلا چھوڑ دو [کہ  
سب کچھ دے ڈالو] اور ملامت زدہ

و عاجز بن کر رہ جاؤ

یہاں ایک حدیث کے حوالہ سے اس نکتہ کو مزید واضح کیا جا سکتا ہے۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اصحاب ثروت صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ بیمار ہوئے تو نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو انھوں نے اپنا پورا مال صدقہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی صدقہ کر سکتے ہو اور انھیں یہ بھی نصیحت کی کہ تم اپنے ورثہ کو مالدار چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے تم انھیں اس حالت میں چھوڑو کہ وہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں (سنن ابوداؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فیما یحوز للموصی)۔

ان تمام تفصیلات سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب دین اسلام میں عبادات کے باب میں اعتدال و توازن سے کام لینے کی اس قدر تاکید ملتی ہے تو زندگی کے دیگر معاملات میں اعتدال سے متعلق اس کی ہدایات و تعلیمات کس درجہ اہم اور موکد ہوں گی۔ ذیل کی تفصیلات سے یہ نکتہ مزید واضح ہو جائے گا۔

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کی رو سے انفاق (جس سے عام طور پر صدقہ و خیرات یا کسی نیک کام میں مال خرچ کرنا مراد لیا جاتا ہے) میں بھی اعتدال کا رویہ مطلوب ہے، اس لیے کہ اس میں بے اعتدالی سے انفاق کرنے والے کا نقصان ہوتا ہے اور اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ کہ انفاق یا مال خرچ کرنے کے بارے میں اعتدال برتنے کی قرآنی تعلیم روزمرہ زندگی میں دوسرے معاملات میں بھی مطلوب ہے۔ قرآن میں مومنین صالحین یا اللہ کے نیک بندوں کی ایک خاص صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ مال خرچ کرنے میں میانہ روی کا رویہ اپناتے ہیں، یعنی فضول خرچی و بخل دونوں سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ

يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا

(الفرقان: ۶۷/۲۵)

اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول

خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی و بخل سے

کام لیتے ہیں بلکہ ان کے درمیان بچ

کی راہ اختیار کرتے ہیں

سیاق و سباق سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس آیت میں انفاق یا مال خرچ کرنا ایک وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اسے صرف انفاق فی سبیل اللہ تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ دوسرے قرآن کریم میں فضول خرچی، حرص اور بخل کی مذمت کرتے ہوئے ان سب بری عادتوں سے دور رہنے کی ہدایت دی گئی ہے، اس لیے کہ یہ خصائل مذمومہ کسب مال و صرف مال کے باب میں غیر معتدل رویہ کے مظہر ہیں اور یہ ایسی خطرناک بیماریاں ہیں جو معیشت و معاشرت دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ بلاشبہ مال کی محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور جب یہ محبت حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے یعنی اس میں بے اعتدالی آجاتی ہے تو انسان کے دل میں حرص و طمع جیسی برائیاں جنم پاتی ہیں جو اسے بالآخر مال خرچ کرنے سے روکتی ہیں۔ پھر اسی سے بخل جیسی مذموم صفت پر دان چڑھتی ہے اور یہ اس انتہا تک پہنچ جاتی ہے کہ ایسا شخص دوسروں کو بھی بخل پر ابھارتا ہے۔ واقعہ یہ کہ یہ بے اعتدالی کا ایک رویہ ہے جس میں خیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے قرآن حرص و بخل سے باز رہتے ہوئے احسن طریقہ سے مال خرچ کرنے کی بار بار تاکید کرتا ہے اور صاحب مال کے ذہن میں یہ نکتہ جاگزیں کرتا ہے کہ اسی میں اس کی بھلائی و کامیابی ہے اور دوسروں کے لیے نفع رسائی بھی۔ یہ آیت اسی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہی ہے:

وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا  
 لَّأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ  
 فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ  
 اور رسوا و فرماں برداری بجلاؤ اور  
 [اپنے مال کو نیک کاموں میں] خرچ  
 کرو۔ یہ تمہارے لیے باعث خیر ہے  
 اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے

بچالیے گئے وہی کامیاب ہیں

یہاں یہ وضاحت اہمیت سے خالی نہ ہوگی لفظ ”شح“ حرص و بخل دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت کے ذیل میں مختلف مترجمین و مفسرین کی تشریحات سے واضح ہوتا ہے۔ درحقیقت حرص کا لازمی نتیجہ بخل ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ملتی ہے جس میں حرص کی مذمت کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ

موجب ہلاکت ہے اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا بخل انسانی رشتوں کو کاٹتا ہے اور رشتہ داروں سے تعلقات کو خراب کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بار خطبہ میں ارشاد فرمایا:

ایاکم والشح فان الشح هلک من کان قبلکم . امرهم بالقطیعة فقطعوا ، امرهم بالبخل فبخلوا و امرهم بالفجور ففجروا (مسند احمد ابن حنبل، المطبعة الہمدیہ، مصر ۱۳۱۳ھ، ۱۵۹۲، ۱۶۰)

(حرص سے بچو، اس لیے کہ حرص نے تم سے پہلے کے لوگوں کو ہلاک کیا۔ لالچ نے انھیں رشتہ داروں سے ناپہلو کرنے پر ابھارا تو انھوں نے رشتہ منقطع کر لیا، انھیں بخل کا حکم دیا، سو انھوں نے بخل کیا، اس نے انھیں برائی پر اکسایا تو وہ برائی میں ملوث ہو گئے)

مال خرچ کرنے کے باب میں غیر معتدل رویہ کو بڑھاوا دینے والی یہ بیماری (بخل) انسان کے لیے کس قدر وبال جان بنتی ہے یا بنے گی اس کا اندازہ آل عمران کی اس آیت (نمبر- ۱۸۰) سے لگایا جاسکتا ہے جس میں اللہ رب العزت نے بخل کرنے والوں کو صاف صاف اس طور پر متنبہ کیا ہے کہ ”جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ ان کے لیے خیر یا بہتر ہے، (حقیقت یہ کہ) یہ ان کے حق میں (انجام کے لحاظ سے) بری شئی ہے۔“

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اسراف (فضول خرچی) کی مذمت اور ممانعت مذکور ہے۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس ممانعت سے دیگر خرابیوں (مال کا ضیاع، مستحقین و محتاجوں کی حق تلفی وغیرہا) کے ازالہ کے علاوہ آمد و صرف میں عدم توازن سے روکنا بھی مقصود ہے، اس لیے کہ بسا اوقات مسرف یا فضول خرچی کرنے والا اپنی آمدنی یا وسعت سے زیادہ مال و دولت لٹا دیتا ہے اور اس بے اعتدالی کی وجہ سے اس کی معاشی حالت ابتر ہو جاتی ہے اور یہی بے اعتدالی اگر اجتماعی طور پر یا حکومت کی سطح پر کی جاتی ہے تو پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے اور متعلقہ حکومت مالی بحران کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اقتصادی نظام

اور معاشی زندگی کے اصول و ضوابط میں آمد و صرف میں توازن پر بہت زور دیا جاتا ہے اور عصر حاضر کے ماہرین معاشیات یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اصول جدید معاشیات کی دین ہے۔ حقیقت یہ کہ اقتصادیات کا یہ بنیادی اصول سب سے پہلے قرآن نے عطا کیا جسے نبی اکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے مزید واضح و مبرہن کیا۔ آپ ﷺ نے کتنے عمدہ اور موثر انداز میں اس اصول کو بیان فرمایا: الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشتہ (مشکوٰۃ المصابیح، باب التانی والحذر، منشورات المکتب الاسلامی، دمشق، ۱۹۶۱ء، ۲/۶۲۷) (خرچ کرنے میں میانہ روی نصف معیشت ہے) یعنی آدمی معاشیات مال خرچ کرنے میں میانہ روی یا اعتدال کا رویہ اپنانے پر رٹنی ہے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث روایت کی گئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ معیشت میں میانہ روی اختیار کرنا آدمی کے عقلمند ہونے کی دلیل ہے (محمد فاروق خاں، کلام نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ۴/۱۰۹)۔ واقعہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ کے ان اقوال شریفہ و بلیغہ کی کی تشریح و ترجمانی کے لیے ورق کے ورق سیاہ کیے جائیں تو بھی ناکافی ہوں گے۔ مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے محولہ بالا پہلی حدیث کے حوالے سے بہت صحیح تبصرہ فرمایا ہے:

”جس طرح آپ ﷺ نے عبادات میں، معاملات میں توازن و اعتدال کی تعلیم دی، اسی طرح اقتصادیات کے معاملہ میں اعتدال و توازن قائم رکھنے کا جو طریقہ بتایا وہ ایک ایسی کلید ہے جس کو خوشحالی کا راز کہا جاسکتا ہے۔“ (فضیل الرحمن ہلال عثمانی، نبی رحمت ﷺ کی تعلیم و تربیت میں حسن اعتدال، ماہنامہ راہ اعتدال [عمر آباد] اعتدال نمبر، ۶/۲، اکتوبر، ۲۰۰۵ء، ص ۹۹)۔

اسی ضمن میں یہ ذکر بھی بر محل معلوم ہوتا ہے کہ نامور مفکر اور عظیم مصلح شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) نے اپنی دعوت رجوع الی القرآن والسنۃ کا مخاطب مسلم معاشرہ کے مختلف طبقات کے لوگوں کو بنایا۔ اہل حکومت اور عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں معاشرتی انحطاط اور حکومت کے زوال

کے اسباب کی نشان دہی کی اور قرآن و حدیث کے حوالے سے ان کے ازالہ کی تدابیر بھی بتائیں۔ اہم بات یہ کہ انہوں نے مسلم حکومت کے زوال کی ایک بہت بڑی وجہ مالی بحران کو قرار دیا اور اس بحران کا اصل سبب حکومت اور اہل حکومت، اہل صنعت و حرفت اور عام لوگوں کے آمد و صرف میں عدم توازن کو بتایا اور ان سب کو اس جانب متوجہ کرتے ہوئے اس باب میں اصلاحی اقدامات کی نصیحت کی (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، التفہیمات الالہیہ، مجلس علمی، ڈابھیل (گجرات)، ۱۹۳۶ء، ۲۱۶/۱-۲۱۸)۔

یہاں یہ اضافہ بھی بے موقع نہ ہوگا کہ قرآن کریم میں (جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا) اسراف کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اس ممانعت کا ایک پہلو تو وہ ہے جس کا ذکر آیا یعنی آمد و صرف میں عدم توازن سے احتراز۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسراف کی ممانعت کا سب سے واضح پہلو کھانے پینے یا روزمرہ زندگی میں مختلف اشیاء کے بے جایا غیر ضروری استعمال سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی چیز کا بے جایا غیر ضروری استعمال بے اعتدالی کی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس باب میں سورہ الاعراف کی یہ آیت کلیدی حیثیت رکھتی ہے، جسے پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے۔ ارشادِ الہی ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ  
کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کر دو بے  
شک وہ (اللہ) فضول خرچی کرنے

(الاعراف: ۳۱/۷) والوں کو پسند بھی کرتا

اس آیت میں گرچہ خاص طور سے کھانے پینے میں اسراف یا فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ کہ یہ آیت اپنے مفہوم کے لحاظ سے بڑی جامع ہے۔ دراصل اس میں ان تمام چیزوں کے بے جایا غیر ضروری استعمال کی ممانعت شامل ہے جن سے انسان روزمرہ زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم کی اس آیت میں معاشی زندگی میں مختلف پہلوؤں سے اعتدال برتنے اور حد سے تجاوز کرنے (جو اسراف کا لازمہ ہوتا ہے) سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مذکورہ آیت سے سب سے قیمتی سبق یہ ملتا ہے کہ اللہ رب

العتزت نے ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے جو نعمتیں عطا کی ہیں یا جو اسباب مہیا کیے ہیں ان کا استعمال نہ صرف جائز ہے بلکہ مطلوب ہے، لیکن اس استعمال میں اسراف نہ ہو یعنی ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، اس لیے کہ ایسا کرنا نعمت کا ضیاع ہے محتاجوں کی حق تلفی ہے اور خود اپنا نقصان ہے اور ان سب سے سنگین یہ کہ منعم حقیقی کی ناشکری ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں صاحب ”ترجمان القرآن“ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو قیمتی نکات پیش کیے ہیں انھیں یہاں نقل کرنا بہت بر محل معلوم ہوتا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:

”خدا نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے سب تمہارے ہی لیے پیدا کیا ہے۔ کھاؤ پیو، زینت و آرائش کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ، مگر حد سے نہ گذر جاؤ۔ دنیا نہیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے۔ یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں الٹ دیں۔ وہ دنیا جو نجات و سعادت کی طلب میں دنیا ترک کر رہی تھی، اب اسی نجات و سعادت کو دنیا کی تعمیر و ترقی میں ڈھونڈنے لگی۔“ (ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ۲۰/۳)۔

حقیقت یہ کہ مولانا آزاد کا یہ قول (دنیا نہیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے) دنیا کے مال و اسباب کے تئیں قرآن کے واضح نقطہ نظر کا خلاصہ اور اس کی اعتدال پسندی کی ایک جامع ترجمانی ہے۔

مختصر یہ کہ نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق قرآن و سنت میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنے کی تعلیم ملتی ہے، بلکہ انسان کو یہ باور بھی کرایا گیا ہے کہ یہ رویہ ایک جانب خود اپنانے والے کے لیے موجب خیر و فلاح ہے اور دوسری جانب اس کے آس پاس رہنے والے یا اس کے ساتھ روزمرہ زندگی بسر کرنے والے بھی اس کے فیض سے راحت و سکون محسوس کرتے ہیں۔

معاشرتی زندگی میں اعتدال سے متعلق قرآن و سنت کی تعلیمات کے علاوہ معاشرتی زندگی میں اعتدال برتنے کے بارے میں بھی ان کی ہدایات و تعلیمات ملتی ہیں۔

یہاں خاص طور سے چلنے پھرنے، بولنے ہنسنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، خوشی و غم کے اظہار، دوستی و دشمنی، تعریف و تنقید جیسے معاملات کے حوالے سے متعلقہ آیات و احادیث کی تشریح و ترجمانی مقصود ہے۔

انسان صبح سے شام تک اپنے کاموں کے سلسلہ میں چلتا پھرتا رہتا ہے۔ اس کی چال کیسی ہو؟ اس باب میں قرآن کی بہت ہی واضح ہدایت ہے:

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاعْظُضْ  
مِنْ صَوْتِكَ (لقمان: ۱۹/۳۱)

اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور  
اپنی آواز کو پست رکھو

اس آیت کی تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں: ”نہ بہت دوڑ کر چلو کہ وقار کے خلاف ہے، نیز گرجانے کا بھی احتمال ہے اور نہ بہت گن گن کر قدم رکھ کہ وضع متکبرین کی ہے، بلکہ بے تکلف اور متوسط رفتار تواضع و سادگی کے ساتھ اختیار کر، جس کو دوسری آیت میں اس عنوان سے ”بمشون علی الارض ہونا“ (اور وہ [رحمان کے بندے] میانہ روی سے چلتے ہیں) ذکر کیا ہے“ (بیان القرآن تاج پبلشرز، دہلی، بدون تاریخ، ص ۸۰۶-۸۰۷)۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن کی نظر میں پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ چلنے میں بیچ کی راہ اختیار کی جائے، بہت تیز بھاگ دوڑ اور بہت سست روی دونوں سے گریز کیا جائے۔ بلاشبہ سنجیدگی اور وقار کا قاضا بھی یہی ہے۔

آیت کے دوسرے حصہ سے آواز کے بارے میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ بولنے میں اسے پست رکھا جائے، یعنی بات چیت کرنے میں بہت چیخا چلایا نہ جائے، اس لیے کہ یہ حد اعتدال سے تجاوز کرنا ہے، اس سے سامع کو تکلیف ہوتی ہے اور یہ شایستگی کے بھی خلاف ہے۔ اس آیت کی تشریح میں بعض مفسرین نے بجا طور پر یہ وضاحت کی ہے کہ آواز اتنی پست بھی نہ ہو کہ سنی نہ جائے اس لیے کہ یہ بھی اعتدال کے منافی ہے۔ اس سے پہلے آیات و احادیث کے حوالہ سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ نماز یا نماز کے باہر قراءت قرآن اور ذکر الہی میں بھی متوسط آواز مطلوب و محمود ہے۔

کھانے پینے میں اعتدال سے کام لینے اور غذا میں کمیت و کیفیت دونوں اعتبار



سے توازن برتنے کی تعلیم قرآن و حدیث سے ملتی ہے۔ اس باب میں اللہ رب العزت کا یہ ارشاد اوپر گزر چکا ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف ۳۱) کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اسراف میں حد سے زیادہ یا ضرورت سے زیادہ کھانا یا کسی چیز کا استعمال کرنا سب کچھ شامل ہے۔ گرچہ اس آیت سے عام معنی میں مال و دولت اور ساز و سامان کے استعمال میں فضول خرچی کی ممانعت مراد لی جاتی ہے، لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کے حوالہ سے اسراف کی اقسام میں واضح طور پر کھانے پینے میں حد سے تجاوز کرنے یعنی ضرورت سے زیادہ اور ضرورت سے کم کھانے دونوں کو شامل کیا ہے۔ معارف القرآن کے مولف گرامی مولانا مفتی محمد شفیعؒ مذکورہ بالا آیت کی تشریح میں اسراف کی مختلف صورتوں کو ذکر کرنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

”اسی طرح یہ بھی اسراف ہے کہ بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے۔ اسی لیے فقہاء نے پیٹ بھر سے زائد کھانے کو ناجائز لکھا ہے۔ (احکام القرآن)۔ اسی طرح یہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کہ باوجود قدرت و اختیار کے ضرورت سے اتنا کم کھائے کہ جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے“ (معارف القرآن، مکتبہ مصطفائی، دیوبند، بدون تاریخ، ۳/۵۳۵)۔

مزید برآں اس کی تائید میں انھوں نے حضرت فاروقؓ کا یہ قول نقل بھی کیا ہے کہ ”بہت کم کھانے سے بچو، کیوں کہ وہ جسم کو خراب کرتا ہے اور، بیماریاں پیدا کرتا ہے، عمل میں سستی پیدا کرتا ہے، بلکہ کھانے پینے میں میانہ روی اختیار کرو کہ وہ جسم کی صحت کے لیے مفید ہے اور اسراف سے دور ہے“۔ یہاں یہ ذکر بھی بر محل معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن القیم نے اپنی مشہور کتاب ”الطب النبوی ﷺ“ میں کھانے پینے میں مختلف قسم کی بے اعتدالی سے جسمانی نظام میں جو خرابی و فساد پیدا ہوتا ہے اس پر تفصیل سے بحث کے بعد آخر میں سولہ اعراف کی مذکورہ آیت کے حوالے سے لکھا ہے: ”اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ بدن میں کھانے پینے کی اس قسم کو داخل کرو جو بدل

ما تَحْلَلُ هُوَ سَكَّةٌ أَوْ كَهَانَةٌ يَشْرَبُ بِهَا مَقْدَرٌ مِنْ كَيْفِيَّةِ الْبَدَنِ لِيُفْعَلَ بِهَا نَفْعٌ يَنْجُو سَكَّةً - اس سے جہاں آگے بڑھا تو اسراف کا شکار ہوا اور یہی دونوں چیزیں صحت کے لیے مضر اور بیماری کا باعث ہیں، یعنی بالکل نہ کھانا پینا یا کھانے پینے میں اسراف“ (ابن قیم الجوزیہ، طب نبوی ﷺ، اردو ترجمہ حکیم عزیز الرحمن اعظمی، الدار السلفیہ، بمبئی، ۱۹۹۳ء، ص ۳۰۶)۔

روزمرہ زندگی کی خوش گواری اور معاشرتی امن و امان میں جذبات و احساسات کو قابو میں رکھنے اور ان کے اظہار میں توازن و اعتدال کا بہت بڑا دخل ہے۔ اس کے برخلاف اس باب میں عدم توازن اور بے اعتدالی سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ میں جو فساد و بگاڑ آتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ انسان کے جذبات غصہ کی حالت میں سب سے زیادہ برا سمجھتے ہوتے ہیں اور زیادہ تر وہ اسی کیفیت میں اپنے توازن کو کھو بیٹھتا ہے اور اور بے قابو ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ ایسی حرکتیں کر ڈالتا ہے جو خود اس کے لیے وجہ پشیمانی اور باعث مضرت بنتی ہیں اور دوسروں کے لیے بھی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ جذبات میں عدم توازن کے مظاہرہ اور اس کے مہلک انجام کی پہلی مثال ہاتیل و قاتیل کے واقعہ سے دی جاتی ہے کہ قاتیل اپنے بھائی کی قربانی کی بارگاہ الہی میں مقبولیت اور اپنی عدم مقبولیت پر غصہ کی آگ میں وہ ایسا بھڑک اٹھا کہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور توازن کو کھو بیٹھا، جس کا نتیجہ بھائی کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قرآن کریم میں غصہ کو پی جانے یا اس حالت میں اپنے کو قابو میں رکھنے کی تعلیم بڑے موثر انداز میں دی گئی ہے اور وہ اس طور پر کہ غصہ پی جانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان نیک بندوں میں شامل کیا ہے جن کے لیے جنت تیار کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

سَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ	اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ	کے حصول کے لیے آگے بڑھو جس
وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ. الَّذِينَ	کی وسعت آسمانوں اور زمین کی
يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ	طرح ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے لیے
وَالكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ	تیار کی گئی ہے جو کشادگی و تنگی ہر حال
النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ	میں [اپنا مال] خرچ کرتے ہیں اور

(آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴) جو غصہ کو ضبط کرنے والے اور جو

لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور

اللہ نیکو کاروں کو پسند فرماتا ہے

اس آیت کے حوالے سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ تبصرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے:

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے۔ بہت سے ظالمانہ و بے دردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم و پشیمان ہوتا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے، (سیرۃ النبی ﷺ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ۶، ۶۶-۶۷)۔ اس کے علاوہ ایک دوسری آیت میں اہل ایمان کے امتیازی خصائص میں کبار گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائی کی باتوں سے اجتناب، اللہ کی دعوت پر لبیک کہنے اور نماز کے اہتمام کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ غصہ کی حالت میں معاف کر دینے والے ہیں۔ فرمان الہی ملاحظہ ہو:

فَمَا أُرِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعٌ  
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ  
وَأَنْفُسِي لِلدِّينِ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ  
يَتَوَكَّلُونَ. وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ  
الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشِ وَإِذَا مَا غَضِبُوا  
هُمْ يَغْفِرُونَ. وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا  
لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ

(الشوری: ۳۷-۳۸) کی دعوت پر لبیک کہا اور نماز کا اہتمام کیا

ان آیات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کی نظر میں غصہ کو ضبط کرنے، اس حالت میں اپنے کو قابو میں رکھنے اور توازن و اعتدال کا دامن تھامے رہنے کی کتنی اہمیت ہے کہ اسے اہل ایمان کی ان خصوصیات میں ذکر کیا گیا ہے جو ان کی شناخت ہوتی ہیں اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انھیں جنت نصیب کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ غصہ کی

حالت میں انسان کیسی کیسی غلط حرکتیں اور تباہ کن کام کر ڈالتا ہے، بخوبی معلوم ہے۔ اس حالت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا یعنی معتدل رویہ اختیار کرنا اور بری حرکتوں یا غلط اقدام سے باز رہنا آسان کام نہیں ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کے اس پر حکمت قول کی معنویت سے کون انکار کر سکتا ہے: قال رسول اللہ ﷺ ما تعدون الصرعة فيكم قالوا الذي لا يصرعه الرجال۔ قال ولكنه الذي يملك نفسه عند الغضب [ کتاب الادب باب من كظم غيظاً ] پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ دے، بلکہ (اصل) پہلوان وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ اس ضمن میں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ غصہ کی حالت میں منفی جذبات پر کیسے قابو پایا جائے اور مزاج کو کس طرح معتدل رکھا جائے، اس کا طریقہ بھی معلم انسانیت حضور اکرم ﷺ نے بتایا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے دو اصحاب کو غصہ کی حالت میں دیکھا جن کا چہرہ اس کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک ایسا کلمہ ہے جسے اگر کوئی پڑھے تو اس کا غصہ جاتا رہے، صحابہ نے دریافت کیا: وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: اعوذ بالله من الشيطان الرجيم (جامع ترمذی، کتاب الادب، باب ما يقال عند الغضب)۔ اس دعا کی حکمت صاف واضح ہے کہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس حالت میں اسے خوب بہکانے کا موقع ملتا ہے، اس لیے جب کسی کو غصہ آئے اور اس کے جذبات برا بیچتے ہونے لگیں تو فوراً اس سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ خود قرآن کریم سے یہی ہدایت ملتی ہے۔ ارشاد الہی ہے:

وَمَا يَنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ  
فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ  
اور جب شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ  
کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا اور

(الاعراف: ۲۰۰/۷) جاننے والا ہے

غصہ پر قابو پانے کے لیے مذکورہ دعا کی حکمت اس حدیث سے اور واضح ہو جاتی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتی ہے، تو جس کو غصہ آئے اسے چاہیے کہ وہ وضو کر لے (سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما يقال عند الغضب)۔ ان سب

کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کی ایک نفسیاتی ترکیب بھی بتائی اور وہ یہ کہ جب کسی کو غصہ آئے تو بیٹھ جائے، اگر اس پر بھی فرو نہ ہو تو لیٹ جائے (سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما يقال عند الغضب)۔ مقصود یہ کہ کیفیت کی تبدیلی سے ذہن بٹ جائے گا اور غصہ کم ہو جائے گا۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ غیظ و غضب کے عالم میں انسان ایک اور جس منفی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے وہ اپنے حریف یا دشمن (جس نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہے) سے انتقام یا بدلہ لینا ہے یا اس پر بھرپور وار کرنا ہے۔ قرآن کریم اس اشتعالی کیفیت میں بھی صبر و ضبط سے کام لینے اور انتقامی کارروائی میں حد سے زیادہ نہ گزر جانے کی ہدایت دی ہے۔ ارشاد الہی ہے:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا  
عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ  
لِّلصَّابِرِينَ (النحل: ۱۶، ۱۷)

اور اگر بدلہ لو تو بس اتنا ہی جتنا تمہیں  
نقصان پہنچایا گیا ہو اور اگر صبر کر لو تو یہ  
صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے

اس آیت میں یہ بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ مخالف یا دشمن کی زیادتی کے برابر بدلہ لینے کی اجازت کے ساتھ یہ حقیقت بھی منتقم کے ذہن میں بٹھانی گئی ہے کہ اگر وہ بالکل ہی معاف کر دے تو اسی میں اس کے لیے خیر ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر ایسی صورت میں انتقام لینے اور اس میں حد سے تجاوز کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ کسی کے خلاف جنگ یا انتقامی کارروائی کے سلسلہ میں زیادتی کرنے یا حد سے آگے بڑھنے کی ممانعت کے باب میں قرآن کی یہ آیت ایک اصولی ہدایت دیتی ہے:

فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ  
بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا  
اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ  
(البقرہ: ۱۹۴)

پس جو تم پر زیادتی کرے ان کی زیادتی  
کے جواب میں اسی کے برابر ان کو  
جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے  
شک اللہ ان کے ساتھ ہے جو اس کے

حدود توڑنے سے ڈرتے ہیں

آیت کے آخر میں اللہ رب العزت سے ڈرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے بخوبی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن کی نظر میں انتقامی کاروائی میں کس درجہ احتیاط مطلوب ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ  
الْمُعْتَدِينَ (المائدہ/۸۷)

اور حد سے آگے نہ بڑھو، بے شک اللہ

حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند

نہیں کرتا

دوستی و دشمنی اور محبت و نفرت میں بھی اعتدال کی راہ اپنانے اور حد سے نہ بڑھنے کی تعلیم قرآن و حدیث سے ملتی ہے۔ بلاشبہ مخالفت و عداوت میں حد سے تجاوز کرنے کے بڑے نقصانات ہوتے ہیں۔ اس کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مخالف یا دشمن کے تئیں عداوت و نفرت کے جذبات جب حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں تو انسان حق و انصاف کے تقاضوں کو پامال کر بیٹھتا ہے، یعنی عدل و انصاف کے فطری اصولوں سے منہ پھیر لیتا ہے۔ قرآن کریم میں کسی کی دشمنی میں حد سے تجاوز کرنے کی ممانعت اس طور پر کی گئی ہے کہ دیکھو اس حالت میں جذبات اس درجہ برا بیچتے نہ ہونے پائیں کہ دشمن کے ساتھ کوئی نا انصافی کا معاملہ ہو جائے۔ ارشاد الہی ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى  
تَعْدِلُوْا اَعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ  
لِلتَّقْوٰى (المائدہ: ۸۷)

اور کسی کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ بر

بیچتے کر دے کہ تم نا انصافی کر بیٹھو۔

[ہر حال میں] انصاف کا معاملہ کرو، یہ

تقویٰ سے زیادہ قریب ہے

ایک دوسری آیت میں اس سے بھی زیادہ واضح لفظوں میں دشمنی میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ جو لوگ اہل ایمان کو خانہ کعبہ میں داخلہ اور عبادت سے روکیں مومنین کا ان سے بدترین دشمن کون ہو سکتا ہے، لیکن ان کے حوالے سے بھی اہل ایمان کو یہ تاکید کی جا رہی ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ  
صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ  
تَعْتَدُوْا (المائدہ: ۲۵)

اور تمہیں اس قوم کی دشمنی جس نے  
تمہیں مسجد حرام سے روکا اس بات پر  
نہ برا بیچختہ کر دے کہ تم [ان کے

ساتھ] زیادتی کرو

اسی معاملہ سے متعلق حضرت علیؓ کے اس قول میں عملی زندگی کے لیے بڑی  
حکیمانہ نصیحت مضمون ہے:

احب حبیبک ہوناً ما عسیٰ ان یکون بغیضک یوماً ما و ابغض بغیضک ہوناً ما  
عسیٰ ان یکون حبیبک یوماً ما (جامع ترمذی، ابواب البر و الصلۃ، باب الاقتصاد فی الحب  
و البغض)

(اپنے دوست سے دوستی میں میانداری اختیار کرو، ممکن ہے وہ کسی دن تمہارا دشمن بن جائے۔ اور  
اپنے دشمن سے دشمنی میں اعتدال برتو، ہو سکتا ہے وہ کبھی تمہارا دوست ہو جائے)

نبی اکرم ﷺ نے کٹر سے کٹر مخالفین اور سخت ترین دشمنوں کے ساتھ عفو و درگزر اور  
رحم و کرم کا جو معاملہ فرمایا اس کی تفصیل میں جانے کی بھال گنجائش نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان  
ندویؒ نے سیرۃ النبی ﷺ میں اس کی وضاحت میں متعدد واقعات بیان کیے ہیں (سیرۃ النبی  
ﷺ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ۲۸۶/۲، ۲۹۰، ۲۹۷-۲۹۹)۔ ان کے حوالے سے سید  
صاحب نے جو تبصرہ فرمایا ہے وہ بہت قیمتی و قابل نقل ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

”انسان کے ذخیرہ اخلاق میں سب سے زیادہ کم یاب، نادر الوجود چیز دشمنوں  
پر رحم اور ان سے عفو و درگزر ہے، لیکن حامل وحی و نبوت کی ذات اقدس میں یہ جنس افراد اس  
تھی۔ دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے، لیکن اخلاق کے دائرہ شریعت میں  
آ کر یہ فرضیت مکروہ تحریمی بن جاتی ہے۔ تمام روایتیں اس اس بات پر متفق ہیں کہ  
آپ ﷺ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا“ (سیرۃ النبی ﷺ، ۲۸۶/۲)۔

خوش و غم کے مواقع بھی انسان کے لیے سخت آزمائشی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ  
ان کیفیات میں جذبات و احساسات کو قابو میں رکھنا اور ان کے اظہار میں معتدل رہنا بڑا

مشکل کام ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ خوشی و غم کی حالت میں توازن و اعتدال قائم نہ رکھنے پر حکم الہی اور سنت رسول ﷺ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور دوسروں کو اس سے تکلیف بھی پہنچتی ہے اور بعض اوقات تو جان و مال کا نقصان بھی ہو جاتا ہے، جیسا کہ آئے دن اس کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس صورت حال میں اعتدال و توازن پر قائم رہنے اور ان کیفیات کے اظہار میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی واضح ہدایت ملتی ہے۔ اس حالت میں قرآن نے اس پہلو سے صبر و ضبط اور توازن و اعتدال کی تعلیم دی ہے کہ جو بھی نعمت یا کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوتا ہے، اس لیے اس حالت میں بہت زیادہ خوش ہونے و اترانے اور جذبات میں بہہ جانے کے بجائے منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ دوسرے دنیوی مال و دولت اور جاہ و منصب آنی جانی یا فانی ہے، اس پر اترانے اور بہت زیادہ مگن ہونے کے کیا معنی۔ اسی طرح جو مصیبت یا پریشانی آتی ہے یا کسی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے وہ بھی اللہ کی مرضی سے۔ تو اس صورت میں بہت زیادہ آہ و اویلا کرنے اور مایوسی کی کیفیت میں ڈوب جانے کے بجائے چاہیے کہ انسان صبر کرے اور اللہ ہی سے رجوع کرے اور اس حالت میں بھی اللہ کا شکر ادا کرے، اس لیے کہ اس کے خزانہ میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اس ضمن میں یہ آیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے:

لَكَيْلًا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ  
كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (المائدہ: ۲۳-۲۵)

تا کہ تم شکستہ دل نہ ہو اس پر جو تم سے  
فوت ہو جائے اور اتراؤ نہ اس پر جو  
تمہیں مل جائے اور اللہ کسی غرور و  
گھمنڈ کرنے والے کو پسند نہیں کرتا

حقیقت یہ کہ خوشی و شادمانی کے موقع پر اترانا و غرور کرنا اور آپے سے باہر ہو جانا اور اسی طرح پریشانی و دکھ کی صورت حال سے دوچار ہو کر رنج و غم میں بالکل گھل جانا اور مایوسی کی کیفیت میں مبتلا ہو جانا، یہ دونوں باتیں توازن و اعتدال کے منافی ہیں اور ناشکری کی علامت ہیں۔ اللہ اسے پسند نہیں فرماتا، جیسا کہ اس آیت سے صاف واضح ہوتا ہے:



وَلَيْسَ أَذْفَنًا الْإِنْسَانُ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ  
 نَزَعْنَا هَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيُؤْمِسُ كَفُورًا  
 وَلَيْسَ أَذْفَنًا نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَاءَ  
 مَسْتَهُ لَيَقُولُنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتِ  
 عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحَ فَخُورًا  
 (سورہ: ۱۱۰/۱۱-۱۱)

اور اگر ہم انسان کو اپنے فضل سے  
 نوازتے ہیں، پھر اس سے اس کو محروم  
 کر دیتے ہیں تو وہ مایوس اور ناشکرا  
 ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد  
 جو اس کو پہنچی، اس کو نعمت سے نوازتے  
 ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میری مصیبتیں دفع  
 ہو گئیں۔ اور وہ اکرٹنے والا اور شیخی

بگھاڑنے والا بن جاتا ہے

واقعہ یہ کہ مال و دولت ملنے یا خوشی کا کوئی اور موقع نصیب ہونے پر فخر و غرور کا  
 مظاہرہ کرنا نہ صرف اللہ کی ناراضگی کا باعث ہوتا ہے بلکہ اس کے بندے بھی اسے سخت  
 ناپسند کرتے ہیں۔ قارون جب اپنی کثیر دولت پر اترانے و گھمنڈ کرنے لگا تو اس کی قوم  
 نے اس پر ناگواری ظاہر کی۔ ارشادِ باری ہے:

إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا  
 يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (القصص: ۷۶/۲۸)

جب اس کی قوم نے اس (قارون)  
 سے کہا: مت اتراد، اللہ اترانے والوں

کو پسند نہیں فرماتا

اس آیت کے حوالہ سے مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ اظہار خیال بہت اہم معلوم  
 ہوتا ہے کہ: انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں۔ مال  
 و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں  
 اظہارِ مسرت کے سیکڑوں مواقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حد اعتدال سے آگے  
 بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، (سیرۃ النبی ﷺ، ۵۴/۶)۔ یہی  
 وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب مادی یا معنوی نعمت ملنے پر  
 مسرت کا موقع ہو تو اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور کوئی نقصان ہو جائے یا کوئی پریشانی یا دکھ  
 لاحق ہو تو صبر کا من پکڑا جائے اور اس حالت میں بھی اللہ کی حمد بجا دینی جائے، اس لیے

اعتدال کا تقاضا یہی ہے۔ شکر و صبر کے باب میں قرآنی تعلیمات کے لیے مثال کے طور پر یہ آیات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں: (البقرہ: ۲۵۲، ۱۵۲-۱۵۳، ۱۷۲، ۲۳۳، الاعراف: ۱۰۷، ۸۷؛ یونس: ۶۰، ۱۰؛ ہود: ۱۱، ۱۵، ۱۱؛ النحل: ۱۳، ۷۸، ۷۹، ۱۲۷، النمل: ۴۰، ۲۷؛ لقمان: ۱۷، ۳۱؛ الدھر: ۶، ۲۳، ۷۰؛ المعارج: ۵۰، ۷۰)۔ نبی کریم ﷺ کے اس معمول سے اس تعلیم کی مزید وضاحت ملتی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب کبھی نبی کریم ﷺ کو کوئی خوشی نصیب ہوتی تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے: الحمد لله، بنعمته تتم الصالحات (سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، اسی کے حکم سے تمام بھلائیاں مکمل ہوتی ہیں)۔ اور جب کوئی غم یا یا پریشانی لاحق ہوتی تو آپ ﷺ یوں فرماتے: الحمد لله علیٰ کُلِّ حال (ہر حال میں اللہ ہی کی تعریف ہے) (محمد ابن عبد الوہاب، مختصر زاد المعاد لابن قیم رترجمہ مقتدی حسن ازہری، الدار السلفیہ، بمبئی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۶۴)۔

مختصر یہ کہ مذکورہ بالا آیات و احادیث کی تشریح و ترجمانی سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے کسی ایک نہیں، بلکہ تمام پہلوؤں (عبادات، اخلاقیات، سماجیات، معاشیات و معاملات) میں اعتدال و توازن دین اسلام میں مطلوب ہے۔ حقیقت یہ کہ قرآن کریم میں جس چیز کو صراطِ مستقیم کہا گیا ہے اور جس کے لیے ہر نماز میں ہم دعا مانگتے ہیں، اسی پر چلنے کا نام اعتدال ہے۔ اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی پوری حیات مبارکہ اسی کی عملی تعبیر پیش کرتی ہے۔ یہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ تبصرہ نقل کرنا بہت بر محل معلوم ہوتا ہے:

”حقیقی اعتدال اتباع سنت کا دوسرا نام ہے۔ ہم میں اعتدال نہ ہونے کا سبب اتباع سنت کا اہتمام نہ ہونا ہے۔ نماز روزہ تو بڑی چیز ہے، رسول اللہ ﷺ کے تو ہر فعل میں اعتدال و انتظام تھا۔ نشست و برخاست میں، خورد و نوش میں، گفتار و رفتار میں۔ اسی کو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: کان خلقہ القرآن کہ قرآن میں جو امور مذکور ہیں وہ آپ ﷺ کے لیے طبعیہ عادیہ کے ہو گئے تھے“ (اسلام کی تعلیمات میں اعتدال، ماہنامہ راہ اعتدال۔ اعتدال نمبر، ۶۲، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۳۲)۔

خلاصہ یہ کہ زندگی کے ہر معاملہ میں اسی صراط مستقیم یا راہ اعتدال کو اختیار کرنے میں خیر و فلاح ہے اور اس کو چھوڑ دینا یا بے اعتدالی کی راہ پر چلنا موجب وبال و نقصان اور باعث فساد و تباہی ہے۔ برادر کرم پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے: ”بے اعتدالی ایک مہلک مرض ہے۔ یہ مرض جس فرد، گروہ اور قوم کو لاحق ہو جائے وہ صراط مستقیم سے بھٹک جاتی ہے اور اپنی تباہی کا سامان خود ہی فراہم کرنے لگتی ہے۔ یہ صرف قوتِ حیات ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ مدتِ حیات بھی مختصر کر دیتی ہے“ (اعتدال۔ اسلامی شریعت کا مزاج، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰)۔

واقعہ یہ کہ اسلام اور اسلامی شریعت کی یہی (ہر معاملہ میں اعتدال) وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہیں، یعنی اس مذہب میں کسی بھی پہلو سے تشدد دروہ اپنانے یا کسی بھی معاملہ میں حد سے تجاوز کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا اپنے کو خطرہ میں ڈالنا ہے اور دوسروں کو بھی تکلیف سے دوچار کرنا ہے اور اسلام کسی صورت میں نہ اسے پسند کرتا ہے اور نہ اس کی اجازت دیتا ہے۔

اللہ کرے ہمیں قول سے زیادہ عمل سے دنیا کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کی توفیق نصیب ہو۔ آمین ثم آمین۔